Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

سجاد بابر کی شاعری میں وجودیت کی پرچھائیاں

SHADOWS OF EXISTENTIALISM IN SAJJAD BABAR'S POETRY

صدف عنبرین
شہید بے نظیر بھٹو ویمن یونیورسٹی پشاور
ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار
چیرمین شعبہ اردو اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

Abstract:

The central idea of existentialism is that man becomes what he wants to be. No destiny has been imposed on him from God or society by force. Man is always surrounded by the confusion of who he is? who brought him into this world? Why is its creator hidden from its sight? Why he was not consulted before he was brought into this world? What is the justification of life if it has to be accompanied bydeath? What are the common values of man and nature? Man, engrossed in these and other countless questions, sets out in search of his center, realizing that it is not possible to determine a higher degree of authenticity unless he determines his biological values. The fundamental discovery of significance is the essence of existence, which can be linked to the ideological endeavors of freedom of thought. Sajjad Babar's era was also an era of strangeness and alienation. Man's relationship with his inner self was broken and the individual was reduced to a mere part of the machine of society. The period in which Sajjad Babar opened his eyes was a period of anarchy. India was going to be divided into two parts. Political ups and downs, economic stagnation and social changes reflected the everyday conditions of human life. In this situation, man's confidence in humanity was lost. Man was involved in a violation of moral values and an uncertain situation which endangered the very existence of man. He was trying to figure out how to maintain the integrity of his being.

Key words.Existentialism, confusion, alienation, social changes, endangered

وجودیت ایک فلسفیانہ تحریک کا نام ہے جو انسان کے بنیادی ڈھانچے اور زندگی کے حقائق سے براہ راست ٹکراؤ کے نتیجے میں ایک زندہ وجود کے بطون میں ابھرنے والی مختلف کیفیتوں مثلاً خوف، تشویش، مایوسی، دکھ، فیصلہ، آزادی اور لغویت وغیرہ کو اپنا موضوع بناتی ہے۔ سورین کرکیگاڈ کا شمار وجودیت کی تحریک کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ وجودیت عربی لفظ وجود سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں زندگی، ہستی، جسم، بدن، ذات، پیدائش، ظہور وغیرہ۔ وجودیت بظاہر کوئی نئی تحریک یا رویہ نہیں ہے، دنیا کے آغاز ہی سے انسان کا وجود اور وجود سے جڑی روایات موجود ہیں۔ وجودیت کا بنیادی منشور خود کو پہچانو ہے۔ وجودیت کی تحریک فرد کی موجودگی اور فرد کی ذات کی آزادی کی علمبردار تحریک کے طور پر سامنے آتی ہے۔

> "لفظ وجودیت کا مفہوم کیا ہے؟ یہ ہر قسم کے محض تجریدی، منطقی، وسائنسی فلسفے کی نفی ہے۔ یہ عقل کی مطلقیت سے انکار ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ فلسفے کو فرد کی زندگی، تجربے اور اس تاریخی صورت حال سے گہرے طور پر مربوط ہونا چاہیے جس میں فرد خود کو پاتا ہے۔ فلسفی ظن و تخمین کا کھیل نہیں بلکہ ایک طرز حیات ہے، یہ سب لفظ 'وجود' میں مضمر ہے۔ وجودی اعلان کرتا ہے کہ میں معروضی دنیا کی بجائے صرف اپنے حقیقی تجربے کو ہی جانتا ہوں۔ اس کے نزدیک ذات ہی حقیقی ہے۔ اس لیے فلسفے کا آغاز اس کی زندگی کے تجربے اور ذاتی علم سے ہونا چاہیے۔ وجودیت فرد کی بے مثل انفرادیت پر اصرار کرتے ہوئے فطرت اور طبعی دنیا کی عمومی خصوصیات کے مقابلے میں انسانی وجود کو بنیادی حیثیت دیتی ہے
> (1)"

اس تحریک کا نمائندہ فرد ژاں پال سارتر ہے جو موجودگی کے نئے معنی تراشتا ہے۔ اس کے مطابق انسان اپنے آزادانہ افکار کو بروئے کار لا کر ہی وجود بنتا ہے۔ وجودیت یورپ کی فکری تاریخ میں وجودیت کا آغاز جنگِ عظیم اوّل کے بعد ہوا۔ عقل پرستی کے شدید رجحان اور سائنس پر بے پناہ اعتماد نے انسان کے بجائے اشیاء کی ضرورت پر زور دیا۔ چنانچہ

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

صنعتی معاشرے کی عدم شخصیتی کو جنم دینے والی قوتوں کے خلاف ایک فکری بغاوت کی ضرورت محسوس کی گئی۔ وجودیوں نے اندازہ کیا کہ فرد کو ان عناصر سے محفوظ رکھنا ضروری ہے جو اس کی شخصی آزادی سلب کر رہے ہیں۔ یہ نظام فرد کی انفرادیت اور بقا کے لیے شدید نقصان دہ ہے جو فرد کو ایک کل پرزے کے طور پر استعمال کر رہا ہے، جس کی وجہ سے معاشرے میں تنہائی اور بیگانگی اور مایوسی کا عمل دخل بڑھ رہا ہے۔ انسان مذہب سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ انسان کے چاروں طرف تاریکی ہے اخلاقیات زوال پذیر ہیں۔ لہٰذا اس صورتحال کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا۔ وجودیت کے پیروکاروں نے فردِ واحد اور اس کے گوناگوں مسائل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور یوں عوامی سطح پر اس فلسفے کو قبولیت کا درجہ عطا ہوا۔ وجودیت کی تحریک پہلی جنگ عظیم کے بعد شروع ہوئی اور اسے 'وجودیت' کا نام جرمنی کے ایک مصنف 'ہائن من' نے دیا ان جنگوں میں انسان کی بربریت کی وہ مثالیں قائم ہوئی جو روز آخر تک یاد رکھی جائیں گی۔ انسانی زندگی کی وقعت، انسان کا احترام، آدمیت سب ملیامیٹ ہو گیا جس کے نتیجے میں انسان کے اندر کرب، درد، تشویش اور انتشار کے عناصر جنم لینے لگے۔ جنگ کے بعد انسان کے پاس محض وجود رہ گیا تھا۔ یہاں ایک نئے انسان نے جنم لیا اور سوچا کہ انسان تو خود میں قیمتی اور اہم ہے۔ وہ اپنی داخلی بصیرت اور قوت کی مدد سے خود اپنے راستے ڈھونڈ سکتا ہے۔ اس تحریک کے تحت مذہب اور روحانیت محض نام کی چیز بن کر رہ گئی لیکن مذہب سے دوری نے انسان کے باطن میں ایک خلا پیدا کر دیا کیونکہ مذہب محض عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ اس کی وجہ سے انسان کو قلبی، ذہنی اور نفسیاتی سکون بھی میسر تھا۔ یہ فلسفہ سے زیادہ ایک نیا انداز فکر تھا۔ ایک دلچسپ اسلوب فکر تھا۔

> "وجودیت کا فلسفہ تنہائی اور بیگانی یا غیریت کا فلسفہ ہے۔ یہ اس دور کی پیداوار ہے جب انسان اپنی تمام اقدار کھو بیٹھتا تھا۔ مذہب سے مایوس ہو چکا تھا اور اسے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آ رہی تھی۔ یہ دور یورپ میں عالمی جنگوں سے پیدا ہوا۔ انسان درندوں اور وحشیوں کی طرح لڑا، ہر قدر کو ٹھکرایا گیا۔ نہ اخلاق کا پاس رہا نہ مذہب کا۔ جنگوں نے مذہب اور اخلاق دونوں کو تباہ کر دیا۔ نوجوانوں کو احساس ہوا کہ ماضی کا اخلاق ان کے مسائل حل نہیں کر سکتا اور مذہب کی طفیل تسلیاں ان کی بے چینی اور تنہائی کو دور نہیں کر سکتیں۔ اگر پرانی اقدار ختم ہو چکی ہیں، مذہب ناکارہ ہو چکا ہے اور فلسفہ بھی دور از قیاس باتوں کا مجموعہ بن گیا ہے تو انسانی درد کا مداوا کیا ہے؟ اس کا جواب وجودیت نے پیش کیا۔" (2)

اس سلسلے میں سجاد بابر کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ سجاد بابر کا دور بھی اجنبیت اور بیگانی کا دور تھا۔ انسان کا رشتہ اپنے باطن سے ٹوٹ چکا تھا اور فرد محض معاشرے کی مشین کا ایک معمولی سا پرزہ بن کے رہ گیا تھا۔ سجاد بابر نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ انتشار کا دور تھا۔ ہندوستان دو ٹکڑوں میں تقسیم ہونے جا رہا تھا۔ سیاسی نشیب و فراز، معاشی بدحالی اور سماجی تبدیلیاں انسانی زندگی کے روزمرہ حالات کی عکاس تھیں۔ تقسیم کے واقعات نے انسان کی بربریت کو اظہار کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ ہجرت کرنے والوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے گئے۔ بے گناہ انسانوں کا بے دردی سے قتل عام کیا گیا۔ عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ اس صورت حال میں انسان کا انسانیت سے اعتماد ختم ہو گیا تھا۔ اخلاقی اقدار کی پامالی اور ایک غیر یقینی صورت حال سے انسان کا واسطہ پڑ گیا تھا جس سے انسان کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا تھا۔ ایسے میں حساس طبیعت شاعر معروضی دنیا کے انتشار اور ہنگامے سے ہونے والے خود کی ذات کے روزن پر کان لگا کے بیٹھا تھا کہ کس طرح وہ اپنے وجود کی سالمیت کو برقرار رکھے۔ سجاد بابر بھی انہی کیفیات سے دوچار نظر آتے ہیں اور اپنی تلاش اور کھوج کے سفر پر نکل پڑتے ہیں۔

عتاب شہر مسلسل یہ حرف حق والے
گھروں کا رُخ نہ کریں ایسے دربدر بھی نہیں (3)

سجاد بابر کے ہاں فرد کی بے بسی، گھٹن، غیر مصدقہ زندگی اور زندگی کی بے معنویت کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ ان کے ہاں منزل سے دوری کے باعث تنہائی، خوف، ویرانی، اور تھکن کے آثار نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری کے پردے پر ایک بھٹکے ہوئے انسان کی شبیہ ابھرتی ہے جسے اپنے دلِ چاک کے احوال اور راستوں کے اُجاڑ، اداس اور المناک منظروں کے مابین ایک مماثلت نظر آتی ہے، جو اس کی تھکن کو مزید بڑھا کر اسے ناآسودہ کر رہی ہے۔

لے کر ساتھ چلے تھے سارے عالم کو
اب خود اپنی ذات کے پیچھے پیچھے ہیں (4)

لبوں کی برف، ساعت کے غار، دل کے بھنور
ہم اشک اشک مگر ہم کلام سب سے ہوئے (5)

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.4 No.3 2021

سجاد بابر کے ہاں وجودیت کا تجربہ تحت الشعور کی تہوں سے پھوٹا ہے۔انہوں نے وفورِ حیرت کے تناظر میں اپنی ذات اور اپنے عہد کی آسیب زدگی، سنسانی اور ہیبت ناکی کو مس کرنا چاہا تو جنس، جبر، خوں، بھید، اور ذات کے خالی پن کی کہنہ صورتیں ان کے ماحول سے اس قدر منطبق تھیں کہ اس راہ میں انہیں قدیم انسان کے واہموں اور اندیشوں سے دوچار ہونا پڑا، سو ان کے ہاں ایک استعجاب اور تحیر کی فضا پیدا ہوتی چلی گئی۔یہ فضا 'میں اور میں 'اور' میں اور وہ' کے تصادم کی فضا تھی اور سجاد بابر کے ہاں اس کرب کی کیفیات کتنی واضح ہیں ان کا اندازہ اس شعر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے خارج میں ان کیفیات کی بظاہر کوئی ٹھوس وجہ سامنے نہیں آتی لیکن ان کیفیات کے ذریعے سجاد بابر نے اپنی زندگی کی مردنی اور کھوکھلے پن کو اپنی ذات کے اکیلے پن میں ظاہر کیا ہے، مگر اس مردنی میں بھی وہ زندگی کے آثار ڈھونڈ لیتے ہیں، وہ دوسروں کو قصوروار ٹھہرانے کی بجائے خود پر الزام لے لیتے ہیں اور یہی وہ نقطہ نظر ہے جو وجودیت کی تحریک کی میراث ہے۔

میں بھی کیا ہوں کہ ان آنکھوں کے کہے میں آ کر
اس سے بیزار ہوا جس کو زمانہ چاہے (6)

خود اپنی مرضی سے شب تار میں رہنا
کیا اچھا تھا انسان کا اک غار میں رہنا (7)

بیگانگی و مغائرت کی یہ صورت حال تو روایتی محبتوں کے رشتے بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ محبوب کی محبت کے اظہار میں خاک بنانے کی سعی سے لے کر اسے فراموش کرنے تک کی کیفیت سجاد بابر کے احساسات اور جذبات کی عمدہ مثال ہے کہ فرد جب خود سے بیگانہ ہو جائے تو محبوب سے بھی رشتہ قائم نہیں رکھ پاتا۔ کرب کی یہ کیفیت اگرچہ تکلیف دہ ہوتی ہے لیکن فرد کو اپنے باطن کی طرف متوجہ ہونے میں مددگار ثابت ہوتی ہے جاور اگر فرد اس کیفیت سے دوچار نہ ہو تو وہ ایک خوابناک اور غیر شعوری ہیجان میں مبتلا رہتا ہے

میں نے برسوں بعد اپنا آپ ڈھونڈا تھا مگر
پھر سے بے خود کر گیا اس کا مجھے پہچاننا (8)
وہ لمس ڈور کی صورت بدن سے لپٹا رہا
پتنگ لُوٹ کے لائے مگر اُڑا نہ سکے (9)

فلسفیانہ سطح پر جب ایک نظریہ کو نظم یا غزل کے کسی شعر پر منضبط کیا جاتا ہے تو پھر وہ پہلوئے فکر کسی خاص سطح پر مقید نہیں رہتا۔اپنے مخصوص دائرے سے نکلتے ہوئے فرد سے اجتماع، اجتماع سے معاشرہ، معاشرے سے بین الاقوامیت اور بین الاقوامیت سے کائنات کی طرف رجوع کرتا ہے۔ سجاد بابر جب خود کو ایک ایسی دنیا میں پاتے ہیں جہاں احساسات و جذبات کو سمجھنے والا کوئی نہ ہو تو وہ خود کو بھری دنیا میں اکیلا محسوس کرتے ہیں۔ ان کو دنیا کی کامیابی اور ناکامی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اپنے اندر کے اجلے پن پر ناز کرتے ہوئے میلی چادر کو بھی اپنا پہچان بناتے ہیں اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں

سوچتا ہوں ورقِ درد پہ کیسے لکھوں
کوئی آنسو جو گرا لفظ کو پھیلا دے گا (10)

وقت کا گندہ لہو چہرے پہ سارے مل چکے
تم سے کس نے کہہ دیا مجھ کو جدا گر دانا (11)

اک لمس تو ملا ہے مگر خون سرد ہے
یہ ہاتھ آپ کا کہ پرایا ہے بولیے (12)

سجاد بابر کی شاعری کا مطالعہ کرنے پر ہمیں ان کے ہاں غیر یقینیت، لوگوں کے درمیان اجنبیت، رشتوں کی لاتعلقی، فرد کا اپنی ذات سے بیگانہ ہونے کا ایک شدید احساس دکھائی دیتا ہے۔ محبوب کے ساتھ اپنے وجود کے ٹکراؤ کا عمل، ذات کی اجنبیت اور بیگانہ پن کو بڑھا دیتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ تعلق استوار کرنے سے پہلے اپنی ذات سے اجنبیت ختم کرنی پڑتی ہے۔ جو لوگ اپنی ذات سے وابستہ نہ ہوں وہ دوسروں سے تعلق نہیں بنا سکتے۔

فصیل شہر نظر کے قریب جب سے ہوئے
اُڑی وہ گرد کہ بیزار ہر طلب سے ہوئے (13)

جانے دھوپ کہاں ڈھل جائے جانے شام کہاں آ جائے
سب اس کے سائے سے لگے ہیں اپنے سنگ بھی ہو لے کوئی (14)

سجاد بابر کے ہاں اپنی ذات سے منسلک لذتوں کے بھی بھرپور حوالے ہیں۔ ان کے اندر تنہائی اور اکیلے پن کا احساس پایا جاتا ہے اور ذات کے اس اکیلے پن کو وہ زندگی کی شام ہونے سے پہلے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ پھر درست ہے کہ انسان لوگوں سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ سجاد بابر کے ہاں بھی نہ صرف اپنے ماحول اور مادی دنیا سے اجنبیت اور اکیلے پن کا احساس موجود ہے بلکہ قریبی رشتوں کے درمیان محبتوں اور قربتوں کا دوریوں اور فاصلوں میں تبدیل ہوتے ہوتے دکھ کا بھی کھلا اظہار موجود ہے۔

پیاس

خیالوں
سوالوں کے دکھ
جاننے کی لگن میں
ہر اک سوچتی آنکھ کے
اَن چھوئے عکس ڈھونڈوں
مگر کب یہ سوچوں
جوابوں کے سُکھ بھی
تو محرومیاں ہیں (15)

سجاد بابر کی اس نظم کا بنیادی موضوع اس کے عنوان ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے یعنی پیاس اور پیاس کا تعلق مختلف حوالوں سے انسان کے اندرون کو ہمیشہ چھوتا رہا ہے۔
سجاد بابر اس نظم میں جو بنیادی منطقہ اپنے پھیلاؤ میں ہمارے سامنے لانا چاہتے ہیں وہ پھیلاؤ میں ایک انسان اور سمٹاؤ میں ایک فرد کا استعارہ ہے سجاد بابر کے اندر خیالات کا الجھاؤ بے شمار سوالات پیدا کرتا ہے حالانکہ بہت سے سوالات اپنے الجھاؤ میں انسان کو دکھی کر دیتے ہیں لیکن سجاد کہتے ہیں کہ سوال انسان اور انسانیت کے بقا اور ارتقا کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے تاہم بیسویں صدی کے یا شاید اس سے بھی پہلے کے بین الاقوامی حالات وواقعات اور انفرادی محرومیاں اگر کسی سوال کے جواب کی صورت میں ہمارے سامنے آ بھی جائیں تو بھی آسودگی ہمارے نصیب میں نہیں ہوتیں۔ خوابوں کے سکھ میں بھی محرومیاں ہی اپنا عکس بناتی ہیں گویا پیاس ہمارے اندر کی آکاس بیل کی طرح مسلسل اور متواتر اپنی جڑیں پھیلاتی رہتی ہے۔ اس نظم میں سجاد بابر نے پیاس کو لامحدود معنوں میں لیا ہے۔ بے یقینی انسان کے مقدر کا وہ حوالہ ہے جو انسان کو کبھی مطمئن نہیں کرتا۔

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ہوک
اور کچھ نہیں ہوتا
اک گھٹا سی اٹھتی ہے
آنکھ کے جھروکوں میں
دھند رقص کرتی ہے
سارے درد لکھتے ہیں
سارے اس سے غافل ہیں
کس کے دل کے کاغذ پر
لفظ پھیل جائیں گے (16)

سجاد بابر کے ہاں انسان کے پیچیدہ مسائل، احساس تنہائی، اضطراب، اور عدم تحفظ کی فضا اظہار و بیان کے نئے نئے سانچوں میں ڈوب کر جلی بجھی دنیا کی راکھ میں چنگاریاں تلاش کرتا ہے محض اس امید پر کہ یہ رات شاہد صبح میں بدل جائے۔ نا آسودگی کی یہ انتہائی صورت ہے جس میں فرد ہجوم کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اپنے باطن میں تنہا ہے۔ جدید دور کے المیوں میں سے ایک المیہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنے ارگرد اشیاء اور اشخاص کا ہجوم تو اکٹھا کر لیتا ہے لیکن اس کے باطن میں تنہائی کا درد بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ سجاد بابر کو بھی جب اپنے ارگرد پھیلی دنیا کا شعور حاصل ہوتا ہے تو وہ خود کو کئی بندھنوں میں جکڑا پاتے ہیں۔ معاشرہ ان کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے، اور وہ ان رکاوٹوں کو عبور کر کے خود کو انفرادیت کے نئے سانچوں میں ڈھالنے کی کوششوں میں سرگرداں اپنے وجود کو امکانات کی آمدجگاہ بنا رہے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ قاضی جاوید، وجودیت، فکشن ہاوس، لاہور، 1998، ص14
2۔ ژاں پال سارتر، وجودیت اور انسان دوستی، (مترجم) قاضی جاوید مشعل بکس، لاہور، ص23
3۔ سجاد بابر، راہرو، اساطیر پبلیشرز لاہور، 1989ص190
4۔ الضاً، ص57
5۔ سجاد بابر، مراحل، ترسیل انٹرپرائز پشاور 1996 ص40
6۔ سجاد بابر، راہرو، اساطیر پبلیشرز لاہور، 1989ص168
7۔ سجاد بابر، مراحل، ترسیل انٹرپرائز پشاور 1996ص66
8۔ سجاد بابر، راہرو، اساطیر پبلیشرز لاہور، 1989ص157
9۔ ایضاً، ص154
10۔ سجاد بابر، مراحل، ترسیل انٹرپرائز پشاور 1996ص18
11۔ سجاد بابر، راہرو، اساطیر پبلیشرز لاہور، 1989ص156
12۔ ایضاً، ص63
13۔ سجاد بابر، مراحل، ترسیل انٹرپرائز پشاور 1996ص39
14۔ سجاد بابر، راہرو، اساطیر پبلیشرز لاہور، 1989ص169
15۔ ایضاً، ص151
16۔ ایضاً، ص183 /